حکم و عبر

مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

جسدِ ملّی کے ناسور

فکرِ ولی اللّٰہی کی روشنی میں

حضرت الامام الشاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ تعالےٰ ایسے دیدہ ور اور صاحبِ نظر انسان تھے کہ ایسے انسان صدیوں میں ہی کبھی پیدا ہوتے ہیں ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

یہ "دیدہ ور" جس وقت پیدا ہوا، اُس وقت برِ عظیم کی عظیم مغل حکومت کھوکھلی ہو چکی تھی اور کہنا چاہیئے کہ اسے گھن لگ چکا تھا اور اس کا دور واپسیں تھا۔

شاہ صاحب حالات کے پیشِ نظر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی وسیع تر حکمت کے پیشِ نظر حرمین شریفین چلے گئے جہاں انہیں حج بیت اللہ کی سعادت کے ساتھ ساتھ حرم مدنی میں حضور خاتم النبیین و المعصومین محمد عربی صلوات اللہ تعالیٰ علیہ و السلام کی مسجد اور گویا آپؐ کے "روبرو" بیٹھ کر آپؐ پر نازل ہونے والی کتابِ مقدس اور آپؐ کے فرمودات پر غور کرنے کا موقع ملا۔ جب کہ حرمین شریفین کے گرامی قدر اساتذہ اور اصحابِ علم سے آپ نے کسبِ فیض بھی کیا۔

ان حضرات کا کہنا یہ تھا کہ یہ ہندی نوجوان ہم سے الفاظ لیتا ہے اور ہمیں معانی و مفاہیم سے نوازتا ہے۔ شاہ صاحب اُس وقت تک حرمین شریفین میں رہے جب تک اللہ تعالیٰ کو منظور تھا اُس کے بعد اُن کی واپسی ہوئی ـــــ نہیں بلکہ انہیں واپس کیا گیا۔

ایسا تاریخ میں بہت مرتبہ ہُوا کہ بعض افراد کو وہاں سے واپسی کا حکم ہُوا ۔ مثلاً ماضی قریب میں بپا ہونے والی عظیم تبلیغی تحریک کے بانی حضرت الامام مولانا محمد الیاس کاندھلوی رحمہ اللہ تعالیٰ بھی مستقل قیام کے ارادہ سے وہاں گئے لیکن بار بار انہیں خواب میں واپسی کا حکم ہُوا اور کہا گیا کہ تم سے کام لیا جائے گا۔

مولانا منحنی وجود کے فرد تھے، زبان صاف نہ تھی، گھبراہٹ کا شکار ہو گئے لیکن اپنے علمی حلقہ کے ایک بزرگ مولانا سید احمد فیض آبادی رحمہ اللہ تعالیٰ (برادر بزرگ حضرت شیخ الاسلام مولانا السید حسین احمد مدنی قدس سرہ و بانی مدرسۃ العلوم الشرعیہ مدینہ منورہ) کے سامنے جب یہ بات رکھی تو انہوں نے فرمایا کہ:

"میاں واپس جاؤ، تمہیں کہا جا رہا ہے کہ تم سے کام لیا جائے گا۔ یہ تھوڑا کہا جا رہا ہے کہ تم جا کر کام کرو۔ کام لینے والے خود لے لیں گے۔"

اسی طرح راولپنڈی کے گاؤں گولڑہ کے مشہور صاحبِ علم بزرگ حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب مرحوم و مغفور کی بھی ایسی ہی خواہش تھی۔

اتفاق کی بات یہ ہے کہ جب وہ مکہ معظمہ تشریف لے گئے تو حضرت الشیخ الامیر امداد اللہ مہاجر مکی قدس اللہ سرہ العزیز کی "بزم عرفان" وہاں قائم تھی۔

پیر صاحب اس کے بادہ نوشوں میں شامل ہو کر حاجی صاحب کے خدام کی فہرست میں آ گئے اور ان سے اپنے عندیہ کا ذکر کیا کہ وہ یہاں مستقل قیام کے متمنی ہیں۔

حاجی صاحب نے غور و فکر کے بعد انہیں واپسی کا فرمایا۔ اور فرمایا پنجاب میں ایک بڑا فتنہ رونما ہونے والا ہے اس میں اللہ تعالیٰ تم سے کام لیں گے۔

پیر صاحب حضرت الشیخ کے حکم کی تعمیل میں واپس آ گئے اور پھر یہاں انہیں قادیانی نبی سے دو دو ہاتھ کرنے کا موقع ملا۔ علاوہ دوسری خدمات کے، انہوں نے سیدنا مسیح عیسیٰ علیہ سلام اللہ تعالیٰ علیہ وصلاتہ کے رفع و حیات پر ایک عظیم الشان کتاب سپردِ قلم کی جو ہمارے مناظرانی لٹریچر میں شاہ کار کا درجہ رکھتی ہے۔

حضرت الامام شاہ ولی اللہؒ کے ساتھ بھی معاملہ پیش آیا۔ وہ ان سب کے بڑے تھے اور ان سے پہلے انہیں وہاں سے واپسی کا حکم ہوا۔

واپسی پر انہوں نے مختلف حوالوں سے کام کیا۔ اور یہ بات بلا خوف تردید کہی

جا سکتی ہے کہ ان کی وفات کے بعد سے اب تک اس پورے خطہ میں" اصلاحِ احوال" کی غرض سے جو تحریک برپا ہوئی، اس میں انہی کے انفاس طیبہ کی گرمی کارفرما تھی۔

اُن کے دور سے بالکل متصل "تحریک اصلاح وجہاد" انہی کے فرزند گرامی حضرت شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالےٰ کی سرپرستی میں شروع ہوئی ــــ شاہ عبدالعزیز ان رجالِ کار میں سے تھے جن پر" استاذالاساتذہ" کے لفظ کا صحیح معنوں میں اطلاق ہوتا ہے۔

تاریخ میں حضرت الامام ابوحنیفہؒ، علامہ ابنِ نجیم، شاہ عبدالعزیزؒ اور مولانا محمود حسن (شیخ الہند) بجاطور پر اس لقب کے مستحق ہیں کہ ہر ایک کی حسنِ تربیت کے نتیجہ میں ایسی ایسی گرامی قدر شخصیات سامنے آئیں کہ ان میں سے ہر ایک آفتاب و ماہتاب کی مانند تھی۔

شاہ عبدالعزیزؒ اس تحریک اصلاح وجہاد کے سرپرست تھے تو امارت حضرت الامام السید احمد شہید البریلوی قدس اللہ سرہ العزیز کی تھی جو ظاہری علوم کے حوالہ سے تو زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے۔ لیکن جناب طالوت کو "بسطۃ فی العلم والجسم" کی نعمت سے نوازنے والے نے انہیں بھی ان حوالوں سے خوب خوب نوازا تھا، حتیٰ کہ شیخ الاسلام مولانا عبدالحی بڈھانوی، مجاہد فی سبیل اللہ مولانا اسمٰعیل شہید اور علمأ صادق پور سمیت لاتعداد اربابِ علم وبصیرت ان کے گھوڑے کی رکاب تھام کر ساتھ ساتھ بھاگنا اپنی سعادت خیال کرتے اور ان کے اشارۂ ابرو کی تعمیل میں ہی اپنی عظمت کا راز پاتے۔

آپ کی اقتدا میں اہلِ بصیرت کو نماز ادا کرکے جو" کیفیتِ حضوری" حاصل ہوتی، اُس کا تو ذکر ہی کیا ــــ لوگ محسوس کرتے کہ صحیح نماز وہی ہے جو سید صاحب کی اقتدا میں ادا ہوئی۔

اس تحریک کے بعد ۱۸۵۷ء کی اجتماعی تحریک کی پُشت پر جن علماء کے فتاویٰ تھے اور جن علماء ومجاہدین کی محنت تھی، ان کی نسبت ولی اللہی ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ان حضرات کو جولاُن ملی اور جو عزم وحوصلہ نصیب ہُوا، وہ بھی شاہ صاحب کے نفس کی گرمی ہی کے سبب۔

اس کے بعد حالات کا رُخ تبدیل ہوتا ہے اور بہتر مستقبل کی غرض سے میدانِ

دعا کے بجائے تعلیم و تعلّم کا راستہ اختیار کیا جاتا ہے تو دیوبند کی تحریک علمی سے لے کر علی گڑھ، ندوۃ العلماء اور جامعہ ملیہ تک کی تحریکوں کے بانی اسی خانوادہ کے فیض یافتہ تھے اور ان کا سلسلۂ تلمذ و سند انہی بزرگوں سے وابستہ تھا۔

اور تاریخ کے قاضی کے اس فیصلہ کو چیلنج کرنا ممکن نہیں کہ انہی علمی تحاریک کی کاوشیں بالآخر حصولِ آزادی کا ذریعہ بنیں۔

تاہم یہ سوال بڑا اہم ہے کہ آزادی حاصل ہونے کے بعد مسلمان قوم کا اجتماعی حال پتلا کیوں رہا اور اب تک برابر رو بہ تنزل کیوں ہے؟ تو ہمارے خیال میں اس کے مختلف اسباب ہیں۔

الف: ایک سبب وہ زخمہ اندازی ہے جو جعلی اور جھوٹی نبوّت کے حوالہ سے غاصب انگریز نے پیدا کی۔ کیونکہ اس کے ذریعہ سے ملّت کا ایک طبقہ (جدید تعلیم یافتہ حضرات) اسلام کی بنیادی تعلیمات کے معاملہ میں ذہنی انتشار کا شکار ہو گئے تو دوسرے طبقہ (قدیم تعلیم یافتہ حضرات) کو اس فتنہ کے دفاع میں اپنی بڑی صلاحیتیں صرف کرنا پڑیں۔ حتیٰ کہ حصولِ آزادی کے ۴۰ برس بعد بھی اس فتنہ کے برگ و بار پوری طرح ختم نہیں ہوئے۔ اس صورتِ حال کے نتیجہ میں بنیادی کام بُری طرح متاثر ہوئے اور اجتماعی انداز سے بہتر مستقبل کے لیے ہونے والی کاوشیں دھری کی دھری رہ گئیں۔

ب: اُس دَور میں قادنیت کے علاوہ بعض اور ایسے علمی فتنے رونما ہوئے جن کے دفاع کی طرف خاطر خواہ توجہ نہ دی جا سکی حتیٰ کہ جب انگریز کے چل چلاؤ کا وقت آیا تو وہ فتنے خاصا حلقہ بنا چکے تھے اور انہوں نے بھی ملّت کی اجتماعی سوچ کو اچھا خاصا دھچکا لگایا۔

اس ضمن میں سنّت کی تشریعی حیثیت کو چیلنج کرنے والے اربابِ علم کا نام لیا جا سکتا ہے جنہوں نے ایک طرح اس مسلّمہ حقیقت کو نظر انداز کیا تو دوسری طرف ایک خاص موقع پر ملّت کے سوادِ اعظم کا ترجمان بن کر ذہنی انارکی کی فضا پیدا کی۔

تقسیمِ ملک کے بعد سے اب تک دستوری اور آئینی میدان میں دینی حوالہ سے جو طبقہ ایک بڑی رکاوٹ کا باعث بنا ہُوا ہے وہ یہی طبقہ ہے، کیونکہ اس نے جیسا کہ عرض کیا، تحریکِ پاکستان کے دَور میں سوادِ اعظم کی ترجمانی کا فرض ہاتھ میں لے کر یہاں

کی بوجوہ مؤثر قوتوں کو خاصا متاثر کیا ہے اور اس وجہ سے یہ رکاوٹ سدِ سکندری بن گئی ہے۔

ج : فرقہ واریت اور اس سے بڑھ کر تکفیر مسلمین کی بے ہودہ مہم نے غلامی کے زمانہ میں خاصے بال و پر نکالے اور تقسیم ملک کے بعد دھیرے دھیرے اس کے اثرات بڑھتے رہے۔ حتیٰ کہ اب اس نے ایک عفریت کی شکل اختیار کرلی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس دھرتی پر جو گناہ ہوتے ہیں ان میں ایک بہت ہی زیادہ زہریلا گناہ "تکفیر مسلمین" ہے — حضور اقدس محمد عربی صلوات اللہ تعالےٰ علیہ وسلامہ نے اس کے بُرے انجام سے اس طرح متنبّہ کیا کہ:

"جو شخص کسی کو کافر کہتا یا اس پر لعنت بھیجتا ہے اور اگلا اس کا مستحق نہیں تو اس کا وبال کہنے والے کی گردن پر ہوگا۔"

لیکن یہاں تو افراد سے بڑھ کر جماعت بلکہ پوری اُمّت کو اس ناوک افگنی کا شکار ہونا پڑا۔ انگریز، دورِ اقتدار میں اس کو ضرورت تھی کہ اس کا ظالمانہ اقتدار ہمیشہ قائم رہے۔ اس مقصد کی غرض سے اُس نے جہاں "نبوّتِ کاذبہ" کا سہارا لیا وہاں ایسے "شمس العلماء، اعلیٰ حضرت، علّامہ اور سجّادگان طریقت" بھی ڈھونڈ نکالے جو اس ظالم کو حق بجانب ثابت کریں، اس کے دور کو امن کا دَور قرار دیں، اُس دَور کے ہندوستان کو دارالاسلام ثابت کریں، اس کے دَورِ حکومت کے دوام و استحکام کے لیے دعائیں مانگیں۔ اور جہاد و تعلیم کے میدان میں اس سے مقابلہ کرنے والے "مردانِ راہِ حق" کو بدعقیدہ ثابت کرکے انہیں کفر و نفاق کے زہر آلود خنجروں سے زخمی کریں اور اس طرح سادہ لوح عوام کو ان کی پشت پر کھڑا ہو کر مقابلہ کرنے کی راہ سے روکیں —— گویا صَدٌّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ —— کا کردار ادا کریں۔

دَورِ غلامی میں "غلامانِ تقیہ" اور "آلِ ابنِ سبا"، کا بھی ایک رول تھا —— مغل ایمپائر، سراج الدولہ، اور سلطان ٹیپو کے خلاف اس طبقہ کی سازشیں اور ریشہ دوانیاں تاریخ کا ایک المناک باب ہے — اس المناک باب پر تفصیلی گفتگو اللہ نے چاہا تو ہم آئندہ کسی وقت عرض کریں گے، اس وقت صرف اس طرف توجّہ دلانا مقصود ہے کہ اُس دَور میں اس طبقہ کے معتقدات اور تاریخی طرزِ عمل سے آنکھیں بند کرکے بعض دوائر میں اس کو

اپنی مجالس میں شامل رکھا گیا۔ حتیٰ کہ یہاں تک المیہ رونما ہوا کہ مسلم سیاسیات کے بعض انتہائی نازک اور حساس معاملات اس طبقہ کے افراد کے ہاتھ چلے گئے اور تقسیم ملک کے بعد اِسی طبقہ کے ایک انتہائی اہم فرد، جس کا تعلق ضلع جہلم سے تھا اور جو سفارت سے لے کر مرکزی وزارت تک کے مزے لوٹ رہا تھا نے ایک موقع پر یہ بڑ ہانک دی کہ اب اس ملک میں سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کا قرآن کوئی نہ سُنے گا۔ اس پر مرحوم بخاری صاحب نے برجستہ کہا ؎

تبرائیو! اب تبرّا کرو — کہ اب وقتِ قرآن خوانی گیا
کرو کو بکو یا علی یا علی — کہ اب ذکرِ اوّل و ثانی گیا

اب وہی طبقہ ہے جو ان مخصوص حالات اور پھر ایرانی انقلاب کے سبب آنکھیں دکھا رہا ہے اور حکومت سے لے کر مذہبی قیادت کی اکثریت خوشامدانہ رول ادا کر کے دینی غیرت کا جنازہ نکال رہی ہے۔

انہی عوامل نے مِل جُل کر حالات کی تصویر بگاڑی اور حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی جانشین مولانا محمد الیاس رحمہما اللہ تعالےٰ کے بقول :

"امّت کی وحدت کو پارہ پارہ کیا اور اس قوم کے افراد کے اُمّت بننے میں رکاوٹ پیدا کی یہ تمام طبقات صرف اس لیے سرگرمِ عمل تھے کہ یہاں انگریز کا اقتدار مستحکم رہے اور ایسی عادلانہ حکومت قائم نہ ہو سکے جس کے پیشِ نظر بڑے چھوٹے کے مفادات یکساں ہوں اور کوئی کسی پہ ظلم نہ کر سکے۔"

اِس خدمت کے صلہ اور نتیجہ میں ان لوگوں کو خطابات سے نوازا گیا۔ مربعے الاٹ ہوئے۔ دربار میں کرسی میسّر آئی۔ لیکن تابکے!

انگریز کے ظالمانہ اقتدار کو کوئی چیز سہارا نہ دے سکی —— اس کی کشتی ڈوبی اور اس طرح کہ جس کے اقتدار کے متعلق کبھی یہ کہا جاتا تھا کہ اُس کے حدودِ مملکت میں سورج نہیں ڈوبتا اب وہ ایک جزیرے میں بند ہے۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ اس کے "یارانِ سرِپل" اپنی سازشوں، ریشہ دوانیوں اور لن ترانیوں کے ساتھ اب تک زندہ و پائندہ ہیں۔

اس افسوسناک صورتِ حال کا سبب کچھ ایسا ہے کہ "سفید صاحب" نے بھنّا کر اقتدار کے سرچشمے "کالے صاحب" کے سپرد کرنے میں عافیت سمجھی تاکہ جن لوگوں کی پیہم قربانیوں

کے نتیجہ میں سونے کی چڑیا اُس کے ہاتھ سے نکل رہی ہے، وہ پھر بھی محروم رہیں گے! اُس نے جاتے جاتے بھی بلا نوشان محبت سے انتقام لیا اور اپنے پیاروں کو نواز کر چلتا بنا۔

جب سفید صاحب کی تربیت یافتہ نسل برسرِ اقتدار آئی تو اس نے اپنے آقایانِ ولی نعمت کی مرتبہ فائلیں نکال کر اقتدار کے استحکام و دوام کے نسخے تلاش کیے تو بات اُس کی سمجھ میں آگئی اور اُس نے

الف : جھوٹے نبوّت کے پرچارکوں کو اپنی سرپرستی میں لے لیا حتیٰ کہ اہم کلیدی پوسٹیں انہیں دے دیں۔ اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی غرض سے پہلے دن سے جنگی محاذ گرم رہا تاہم ۱۹۷۴ء میں ایک مرحلہ سر ہُوا اور وہ بھی بعض اس حد تک کہ انہیں کتاب و دستور میں جسدِ ملّت سے الگ کر دیا گیا۔ رہ گئے باقی معاملات تو ان کا حال جوں کا توں ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ اسی طرح جسدِ ملّت کو جونک بن کر چمٹے ہوئے ہیں۔

اِس محاذ پر ہوش، تدبّر اور خلوص سے کام کرنے والوں کا قافلہ لُٹ گیا اور راہی ملکِ بقا ہوگیا۔ اب ایک طرف حکمران ہیں جن کا خلوص سے دُور کا واسطہ نہیں تو دوسری طرف ان عظیم لوگوں کے "وارث" ہیں، جو اہلیت کی بنا پر کم اور دوسرے ذرائع سے زیادہ وارث بنے ہیں — خلوص کی تلاش مشکل، وہ اگر ہے تو ہوش و تدبّر ندارد، نتیجہ یہ ہے کہ پتے جھاڑنے اور ٹہنیوں کی اصلاح کی تو سب کو فکر ہے، اِس سے آگے کچھ نہیں۔

ہونا یہ چاہیئے تھا کہ مرزائی نبوّت اور مرزا کے خاندان کے مادی وسائل پر کاری ضرب لگائی جاتی — لیکن افسوس کہ ایسا نہیں — افسوس کہ آج چودھری افضل حق سے لے کر مولانا تاج محمود تک ایک ایسا نہیں جو ربوہ کے معاشی وسائل پر ایک خاندان اور اس کے لگے بندھوں کے مفادات کے خلاف آواز اُٹھائے۔

اگر غیر مسلم اوقاف میں یہاں کے وسائل شامل کر لیے جائیں اور ربوہ کی شہری پراپرٹی وہاں موجود آبادی کے سپرد کر دی جائے تو یہ فتنہ دم توڑ کر رہ جائے گا۔ لیکن اس کا شعور کسے ہو؟ بدقسمتی سے ہمارے یہاں غریب عوام کے مذہبی جذبات سے کھیل کر اقتدار و سیاست کی دکان چمکانے کا رواج پڑ چکا ہے، اسی عافیت کے راستے کو مذہبی قیادت نے اپنا لیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اصل مسائل کا احساس نہیں۔

ب : سنّت کی تشریعی حیثیت کا انکار کرنے کے باوصف جو لوگ تحریکِ پاکستان کے حوالہ سے سوادِ اعظم کی صفوں میں گھُسے انہیں نکال باہر کیا جاتا اور انہیں ع ایاز قدرِ خود بشناس

کی نصیحت کی جاتی۔ لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اہلِ اقتدار سے لے کر اہلِ سیاست تک، سبھی نے محسوس کر لیا ہے کہ عافیت اسی میں ہے کہ سنت کی تشریعی حیثیت متنازعہ فیہ بنی رہی تاکہ اس طرح ہمارے اللّے تللّے چلتے رہیں۔

حیرت ہے کہ ایک عرصہ سے یہاں "لا الٰہ الا اللہ" کی رٹ بہت لگتی ہے لیکن "محمد رسول اللہ" کی بات بہت کم کی جاتی ہے۔

جب اللہ تعالیٰ نے اپنے ساتھ اپنے محبوب کریم کا تذکرہ ہر جگہ رکھا تو ہمارے یہاں یہ سوانگ کیوں رچایا گیا کہ آدھے کلمہ پر اکتفا کر لیا گیا؟

شاید اس میں یہی راز ہے کہ نہ محمد کریم اور ان کی سنت کی بات ہوگی نہ ہی قرآن کی تشریح و ترجمانی کا مرحلہ آئے گا۔ اور اس طرح اسلام کی خدمت کے جھوٹے دعوؤں کے باوصف عملاً کچھ نہ ہو سکے گا۔

اے کاش! لوگوں کو خیال ہوتا کہ سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خوارج سے گفتگو کرنے کی غرض سے "حبر الامۃ"، "ترجمان القرآن" سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو بھیجا تو اس سے منع فرمایا کہ قرآن کو درمیان میں نہ لانا۔

ح : فرقہ واریت کے عفریت کا سر کچلنے کے بجائے اسے بھی مزید پالا گیا کہ اس میں ہے — لڑاؤ اور حکومت کرو — کا راز اسی میں ہے، بلکہ اب تو سنتم یہ ہوا کہ جو لوگ انگریز کے اقتدار کے دور کے ہندوستان کو دارالاسلام کہتے، انہیں یہاں بھی پذیرائی حاصل ہوئی اور ہر جماعت و فرد پر فتوائے کفر لگانے والے اب مسلمانوں کے سب سے بڑے خادم قرار پائے اور جو شخص اس فتنہ کا بانی تھا اسے یہاں کے پریس اور ذرائع ابلاغ نے "امامت" کے منصب پر فائز کر دیا۔ معلوم نہیں کہ یہ حقائق کی کون سی قسم ہے اور اس کو کس کی خدمت قرار دیا جا رہا ہے؟

د : یہی "غلامانِ تقیہ" کا ہے کہ ان کی ہر غلط ادا کو بھی برداشت کیا جا رہا ہے اور ان کی فتنہ سامانیوں کی طرف کسی کی توجہ نہیں۔ ان کے معتقدات، تاریخی کردار اتنا واضح ہے کہ کسی رعایت کی گنجائش نہیں اور خود وطنِ عزیز میں ان کے ہاتھوں جو ہوا وہ سب سے بڑھ کر ان کی فسادی ذہنیت کا ثبوت ہے لیکن فیا حسرتا کہ پھر ان کی خوشامد!

سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح ہم سنبھل سکیں گے؟ ہمارے ادبار و تنزل کی رات ختم ہو جائے گی؟ معاشرے کو امن نصیب ہو جائے گا اور انسانیت کے دکھ دور ہو جائیں گے؟

ہمارا ایک ہی جواب ہے کہ نہیں اور بالکل نہیں۔

بلکہ اصلاحِ احوال کی ایک ہی شکل ہے اور وہ یہ کہ اس مفکر و دانشور کی فکر میں غوطہ زن ہو کر ہوش و تدبر سے عمل کی راہیں استوار کی جائیں، جس کا ہم نے ابتدا میں ذکر کیا۔

اس کے قلم سے نکلے ہوئے ہزاروں صفحات میں سے ہر صفحہ بحمد اللہ محفوظ ہے، پاک و ہند سے کے مصر و حجاز تک ان کی اشاعت ہو رہی ہے، ان پر حواشی لکھے جا رہے ہیں۔ ان کی تشریحات میں کاغذ ہو رہے ہیں۔ اور ان کے مختلف زبانوں میں تراجم ہو رہے ہیں لیکن یہ تو صرف ان دانشوروں کی شوخیاں ہیں جو "لغت ہائے حجازی و غیر حجازی" کے "قارون" ہیں جنہیں لکھنا پڑھنا سب آتا ہے لیکن جو عمل کی قوت سے عاری ہیں۔

ایسے "قارون"، شوخیٔ گفتار کے امام ہوتے ہیں لیکن عمل کے میدان کے کھوٹے —— جب کہ بقول مولانا ابوالکلام آزاد

"میرے بھائی اپنی تمام صلاحیتیں علم پر ہی نہ خرچ کریں کچھ حصہ عمل کو بھی دیں۔"

عمل کے لیے امام ولی اللہ رح کی معرکۃ الآرا کتاب "تفہیمات الٰہیہ" کے جزو اوّل کی تفہیم ۶۶ کافی ہے۔ اس میں امام موصوف نے "اخلاقی زوال" پر بعض طبقات کے حوالہ سے بڑی خوبصورت گفتگو کی ہے اور بتلایا ہے کہ کس طرح مختلف طبقات اپنی غلط روی سے ملت کے زوال کا باعث بن رہے ہیں۔

انہوں نے اسلام کے دامنِ اتحاد کو تار تار کرنے والی قوتوں میں سب سے پہلے شیعہ و روافض کا شمار کیا اور پھر اس میں ہر اس طبقہ کو شامل کیا جو نئے علم کلام کا مدعی بن کر سامنے آتا ہے —— ان کے اس تجزیہ کو سامنے رکھ کر سوچیں کہ آج کی جھوٹی نبوت اور سنت کی تشریعی حیثیت کے منکر کیا نئے علم کلام کے دعوے دار نہیں اور باقی دو طبقات جن کا ہم نے ذکر کیا وہ ملت میں تفریق و انتشار کے مجرم نہیں؟

اگر یہ دونوں باتیں صحیح ہیں تو پھر سوال یہ ہے کہ اس جدت پسندی اور ذوق تفریق کو ٹھکانے لگانے کی کیا سبیل ہوئی؟

شاہ صاحب کا تجزیہ ہے کہ یہ چیزیں یعنی جدت پسندی اور انتشار و تفریق زوال پذیر قوموں کے من پسند اور محبوب مشغلے ہوتے ہیں۔ وہ آئے دن نئے شگوفے چھوڑنے میں ماہر ہوتی ہیں اور انتشار و تفریق سے انہیں گہری مناسبت حاصل ہوتی ہے۔ اور بقول